ڈاکٹر سید محمد یوسف

اسلام میں عقل کا کردار

اسلام کا اولیں تخاطب عقل سے ہے بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ اگر آپ ایک انسان کو کسی بھی فکر کی طرف دعوت دیں تو اس کی کونسی قوتوں اور صلاحیتوں کو مخاطب کریں گے؟ خدا نے انسان کو حواس خمسہ اور عقل ـــ سادہ فطری عقل ـــ کی ایک قدر مشترک سے نوازا ہے۔ حواس خمسہ فکر و نظر کا مواد مہیا کرتے ہیں، فکر و نظر کی دعوت عقل تک پہنچاتے ہیں اور عقل اس مواد سے کام لینے اور دعوت کو قبول یا رد کرنے کی ذمہ دار ہے۔ دعوت کا فکری طریقہ تو یہی ہے لیکن اگر اس کے مقابلہ میں کوئی غیر فطری طریقہ نہ ہو تو پھر اسلام کی کوئی امتیازی شان باقی نہیں رہتی عقل سے اسلام کا تخاطب جو اتنا واضح اور نمایاں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام عقل کو جگاتا ہے، بیدار کرتا ہے، اگر و پیش کے حقائق سے دوچار کرکے چونکاتا اور جھنجھوڑتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے سے اپنی بات منوانے کا ایک طریقہ وہ بھی ہے جسے "تنویم" کہا جاتا ہے، یعنی یہ کہ مخاطب کی عقل کو سلایا جائے، اس کی عقل کی مقاومت کو ختم کر دیا جائے تاآنکہ وہ اپنی عقل اور ارادہ سے کام لے کر دعوت قبول کرنے کے بجائے داعی کے ارادے کا محض بے عقل تابع بن جائے۔ اسلام سے پہلے جو دین آئے ان کی طرف دعوت میں اس طریقہ سے احتراز نہیں کیا گیا۔ چنانچہ قرآن شاہد ہے کہ طفل گہوارہ کو بولتے دیکھ کر، مردہ کو زندہ کرتے دیکھ کر، چڑیوں کے منتشر اجزا کو یکجا ہوتے اور ان میں جان پڑتے دیکھ کر عقل مدہوش ہو جاتی ہے یہاں تک کہ جس دعوت کو سوچ سمجھ کر بحالتِ ہوش قبول کرنے کو تیار نہ تھی اسی دعوت کا بحالتِ مدہوشی اتباع کرنے لگتی ہے۔ مفتی عبدہٗ اس کو بجا طور پر "ادھاش" کا طریقہ کہتے ہیں[1]۔ یہ طریقہ کچھ ایسا فرسودہ نہیں، آج بھی طرح طرح سے کارفرما نظر آتا ہے۔ "تنویم مقناطیسی" (Hypnotism) اس کی بھیانک شکل ہے۔ جو صوفیہ اپنے کاروبار کی

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے میری کتاب "جیتا جاگتا" (انجمن ترقی اردو، کراچی)، باب "عقل نقل اور کشف"۔

بنیاد کرامات پر رکھتے ہیں وہ اسی طریقہ سے کام لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے متبعین کو بے چون وچرا اطاعت پر تو آمادہ کر لیتے ہیں لیکن ان کے قوائے عقلی کو بیدار نہیں کرتے، چنانچہ ان کے حلقوں میں توحید اور شرک و بدعت گڈمڈ ہو کر بلا تمیز عقل بیک وقت قابل قبول بن جاتے ہیں۔ سماع، رقص اور بخور (خوشبو کا دھواں) مُنوّمات ہیں جو عقل کو سلانے میں مدد دیتی ہیں۔ صوفیہ کا وجد اور حال مجازی معنی میں نہیں بلکہ حقیقت میں شراب کے نشہ، مدہوشی اور قوائے عقلی کے تعطل کا مرادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیہ کا جذب اور حال عمل کا موجب نہیں بنتا۔ عمل کا باعث یقین ہوتا ہے اور یقین علم کے اعلیٰ مدارج میں سے ہے۔ علم، عقل و ہوش کی برقراری سے نہ کہ جذب اور حال سے حاصل ہوتا ہے یقین عقل و تمیز کی یک سوئی اور ارتکاز و استقرار کا نام ہے۔ سیاست اور حکمرانی کے میدان میں دیکھیے ایک آمر و ڈکٹیٹر، سب سے پہلے عوام کو اپنی شخصیت سے مرعوب کرتا ہے، اپنی اتفاقی کامیابیوں کو کرامات کا رنگ دیتا ہے، پھر عوام سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی عقل بالائے طاق رکھ کر اس کی اطاعت میں لگ جائیں۔ مثلاً ایک آمر فوج کی مدد سے عوام کو ساتھ لیے بغیر ملوکیت کا خاتمہ کرتا ہے، عالمی طاقتوں کی باہمی رقابت سے فائدہ اٹھا کر استعمار کے خلاف کامیابی حاصل کرتا ہے، اس کے بعد عوام سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اشتراکیت کو قبول کر لیں جس کے معنی، مفہوم، نظام اور فلسفہ سے وہ قطعاً ناآشنا ہیں۔ اشتراکیت کو منوانے کا یہ طریقہ وہی ادھاشن کا طریقہ ہے۔

بسا اوقات یہ مدہوشی افراد اور مجموعہ افراد یعنی اقوام کی خود پیدا کردہ بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ہم ایک قوم کو ہوائی جہاز بناتے، ذرہ کا دل چیرتے اور چاند پر کمند پھینکتے دیکھتے ہیں اور ایسے مدہوش ہوتے ہیں کہ اس کا رقص، سرود، عریانیِ تن، طریقِ ازدواج، تہی آغوشیِ زن سب ہی کچھ اختیار کر لیتے ہیں۔ ہوش کے لمحات میں آپ جس سے بھی پوچھیں وہ سائنس کی ترقی اور معاشرت کے ان اطوار میں رشتہ قائم کرنے سے عاجز ہوگا۔ اسی پر مزید قیاس کیجیے، زمانۂ حال کی تاریخ شاہد ہے کہ سائنس کی ترقی اور مادی خوش حالی، سرمایہ دارانہ نظام اور سودی بنک کاری کے ساتھ لازم ملزوم نہیں۔ ایک نیا شیوعی نظام (کمیونزم) حریف بن کر اٹھا اور اس نے ایسی مادی طاقت پیدا کی کہ سرمایہ دار پر راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ لیکن ہماری مدہوشی اور مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ "یک نہ شد دو شد"۔ اب ہم اس بحث و تکرار میں الجھے ہوئے ہیں کہ ہماری ترقی کی راہ سرمایہ داری ہے یا شیوعیت۔ اگر عقل سے رجوع کیا جائے تو وہ کہے گی کہ جب ایک سرمایہ داری نظام لازمی نہیں ٹھہرا تو شیوعیت ہی پر کیا موقوف ہے، اس کا بدل کوئی اور تیسرا بلکہ چوتھا یا پانچواں نظام بھی ہو سکتا ہے لیکن ہمارے

یہاں عقل کا کام یہ رہ گیا ہے کہ ہم مدہوشی کے عالم میں جس کامیاب تو دولت نظام کی طرف جھک پڑیں اس کی پیرایہ پوشی کے لیے اسلام میں جگہ نکال لیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ موجودہ دنیا کے ہر طاقت ور نظام میں سے کچھ اجزا اسے کر ایک ملغوبہ تیار کریں اور اس طرح سارے ہی رقیبوں سے سرٹیفیکیٹ حاصل کر لیں:

رقیب سرٹیفیکیٹ دیں تو عشق ہو تسلیم — یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

(اکبر)

اسلام نے دعوت میں کہیں ادہاش کے طریقہ سے کام نہیں لیا۔ معجزات جو محمد صلعم کی طرف منسوب ہیں ان کے بارے میں جو بھی اختلاف ہو، اس پر تو سب کا اتفاق ہوگا کہ اسلام نے دعوت کی بنیاد معجزات پر نہیں رکھی۔ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح قرآن کے صفحات موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے معجزات سے بھرے پڑے ہیں اسی طرح محمد صلعم کے معجزات بھی مذکور ہوتے۔ عملی طور سے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی کوئی مثال نہیں کہ کوئی دعوت سے انکار کرتا ہو تو محمد صلعم نے معجزہ دکھا کر اس کی عقل کو عاجز کیا ہو۔ یہ ضرور ہے کہ جو اصحاب ایمان کی دولت سے مالا مال تھے جیسے ابوبکرؓ وہ بلا تامل دل سے مانتے اور زبان سے کہتے تھے کہ محمد صلعم جو کچھ بھی فرمائیں وہ حق ہے خواہ عقل کے لیے معجزہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جو لوگ دعوت پر ایمان نہیں لائے تھے انھوں نے دعوت قبول کرنے کے لیے جب کبھی معجزہ نمائی کی قید لگائی اور معجزہ صراحۃً طلب کیا تو ان کو ایک ہی جواب ملا اور وہ یہ کہ محمد صلعم کا معجزہ تو قرآن ہے۔ قرآن کوئی منتر، زمزمہ نہیں جس کا خطاب عقل سے نہ ہو، بلکہ سیدھی سادی صاف سمجھ میں آنے والی عربی زبان میں ہے (بلسان عربی مبین) اور اسی لیے ہے کہ تم اسے عقل سے سمجھو (لعلکم تعقلون)۔ چونکہ دعوتِ اسلام کی مخاطب عقل ہے اسی لیے قرآن میں عقل سلیم اور غیر سلیم کے فرق کو اتنا کھول کر بیان کیا گیا ہے اور ایسی عاجزی اور ترشی اور طنز کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ کسی اور مذہبی کتاب میں شاید ہی اس کی مثال پائی جاتی ہو۔ جب عقل کی بات کی جائے اور مخاطب عقل سلیم نہ رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ عقل کی بات کرنے والا خود ہی عاجز ہو جائے گا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ عقل کی بات چھوڑ کر معجزہ سے کام لے، ادہاش کا عمل کرے۔ اس سے اسلام کو صریح انکار ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کھلے الفاظ میں عقل غیر سلیم کے آگے اپنی عاجزی کا اعتراف کرتا ہے: ختم اللہ علی قلوبھم ۔ ۔ ۔ ۔ الخ۔ عقل غیر سلیم وہ ہے جو وحی کی برتری تسلیم کیے بغیر یا وحی سے رجوع کیے بغیر کوتاہ بین نفس حیوانی کے تقاضوں سے مغلوب ہو، جسے "ھویٰ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کچھ لوگ وحی پر اس لیے کان نہیں دھرتے کہ وہ "تقلید آبا" میں جکڑے ہوتے ہیں۔

قرآن تقلید آبا کی مذمت کر کے انھیں غیرت دلاتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ غیر عاقل یعنی غیر مسلم آبا کی تقلید مذموم ہے۔ عاقل یعنی مسلم آبا سے ہدایت نہ حاصل کرنا عقل کی نہیں بلکہ اونچی عقل کی بات ہے، جیسا کہ ہر ناخلف کا شیوہ ہوتا ہے۔ اگر عالم باعمل آبا کی تقلید سے روگردانی اور بیزاری کو عقل کا معیار قرار دیا جائے تو پھر تو اسلامی معاشرہ میں "بیٹلز" اور "ہپیز" ہی پیدا ہوتے رہیں گے۔ کچھ ایسے ہیں جو وحی کی برتری کو مانتے ہیں اور وحی ان کے پاس موجود بھی ہے لیکن اس سے استفادہ نہیں کرتے۔ ایسے لوگ کمثل الحمار یحمل اسفارا، "چارپایہ برو کتابے چند" کا مصداق ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو صریح عناد رکھتے ہیں، ایسے لوگوں سے کوئی امید رکھنا عبث ہے۔

عقل سلیم رکھنے والا جو "ھویٰ" سے مغلوب نہ ہو اور عناد سے پاک ہو وہ اسلام کی دعوت قبول کرتا ہے اس لیے کہ اس کا تخاطب عقل سے ہے۔ دعوت کے مرحلہ میں اسلام تفکیر فی الخلق پر اکساتا ہے۔ گرد و پیش کے طبیعی عجائبات اور تغیرات پر غور و فکر کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس غور و فکر سے عقل مطبوع میں جو سوالات ابھرتے ہیں اسلام انھیں پر زور دے کر ان کے جوابات کی تلاش و جستجو کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایک مرتبہ یہ تلاش اور جستجو بیدار ہو جائے اور قوت پکڑلے تو عقل انسانی از خود توحید کی دہلیز تک پہنچ جاتی ہے، اسلام ہاتھ پکڑ کر الواحد کا وہ جلوہ دکھاتا ہے جو تشبیہ و تجسیم سے منزہ ہے۔ اسی طرح بنیادی طور پر نیک و بد کی تمیز عقل مطبوع کا خاصہ ہے چنانچہ نیکی کے حق میں اور بدی کے خلاف اسلام بجز اس کے اور کوئی دلیل نہیں لاتا کہ تمھاری عقل مطبوع، تمھاری فطرت اس کو نیک و بد بتاتی ہے۔ "معروف" و "منکر" کے معنی ہی ہیں تمھارے دل کی قبول کی ہوئی اور رد کی ہوئی چیز۔ نیک و بد کی بنیادی تمیز، جو عقل مطبوع کا خاصہ ہے، انسان کو ایک مکمل نظام اخلاق اور ضابطۂ حیات کی تلاش پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن اس تلاش میں عقل انسانی زمان و مکان کی قیود میں جکڑا بند ہونے کی وجہ سے مکمل نظام اخلاق و ضابطۂ حیات سے دو چار ہاتھ لب بام رہ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ جب وحی الٰہی اس کی دستگیری کرتی ہے تو وہ احسان مندی کے جذبے کے ساتھ اس کے پیچھے ہو لیتی ہے اور اس کو اپنا مخالف یا غیر سمجھنے کے بجائے سچا معاون اور واقف کار رہبر جانتی ہے۔ جیسے ہی عقل وحی پر اعتماد کرتی ہے نبوت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ دعوت کے مرحلہ میں اسلام کا تخاطب تمامتر عقل مطبوع سے ہے۔ اللہ کے وجود اور وحدانیت کو پہچاننا اور اپنی کوتاہیوں کے

پیش نظر وحی کی ضرورت کو محسوس کرنا خالصتہً عقلِ سلیم کا کام ہے۔ یہاں تک کہ اگر اسلام کی دعوت نہ بھی پہنچے تو اجمالی توحید اور نظامِ اخلاق کی تلاش کی حد تک عقل کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔

ایمان لانا عقل کا ذمہ دارانہ فعل ہے اس کی نوعیت خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ایمان لانے کے بعد عقل وحی کی برتری اور اس کی رہنمائی تسلیم کرتی ہے۔ اب عقل اپنی مرضی اور اختیار سے اپنی تکمیل ذات اور فلاح دارین کی خاطر اپنے آپ کو کمالِ علم و قدرت رکھنے والی ہستی کے سپرد کر دیتی ہے اور اس کے اوامر و نواہی کی منتظر رہتی ہے، اسی کا نام اسلام ہے۔ اتنا تو ظاہر ہے کہ یہ عقل کی طرف سے ایک ضبط و نظم کا التزام ہے اور ضبط و نظم تکمیل ذات کے لیے ہوتا ہے۔ صلاحیتوں کو بے راہ روی سے محفوظ کر کے انھیں ترقی دینے اور بروئے کار لانے کے لیے ہوتا ہے۔ عقل کی کوششیں بھی ضبط و نظم ہی سے بارآور ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ایمان اور اسلام کو عقل کی آزادی پر قدغن اور اس کے لیے زنجیر پا سمجھتا ہے تو اس کو اختیار ہے کہ اسی مرحلہ پر وحی کا جُوا اپنے سر سے اتار پھینکے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کرکٹ کا کھیل یا کوئی اور کھیل: کھیل کے قواعد و ضوابط کا پابند ہو کر ہی انسان اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے اور اپنی مساعی کو بارآور بنا سکتا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ قواعد و ضوابط کا التزام کر کے وہ اپنی آزادی مفت کھو رہا ہے تو اس کو چاہیے کہ کھیل میں شریک ہی نہ ہو اور بے قاعدہ اندھا دھند گیند اچھال کر اپنا دل خوش کرے اور بعد کو وقت گزرنے کے بعد اپنی صلاحیتوں کے ضائع جانے پر افسوس کرتا رہے۔ البتہ اس کی کسی کو اجازت نہیں ہوگی کہ قواعد و ضوابط کا التزام کر کے کھیل میں شامل ہو اور پھر اپنی عقل کے زعم میں ان قواعد و ضوابط سے سرتابی کرے یہاں تک کہ ان قواعد و ضوابط میں میخ نکالے۔ ہمارا سب کا آئے دن کا تجربہ ہے کہ بعض پست ہمت اور خود غرض کھلاڑی اس قسم کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ اردو کی مثل "ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا" انھیں لوگوں پر صادق آتی ہے۔

سب سے اہم اس فرق کو ملحوظ رکھنا ہے کہ دعوت کے مرحلہ میں اسلام کا خطاب "عقلِ سلیم" سے ہے اور قبولِ دعوت کے بعد خطاب "عقلِ مسلم" سے ہے۔ دونوں میں بنیادی فرق ہے جسے بسا اوقات نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اسی باعث بہت سے مغالطے اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ عقلِ سلیم کسی کی تابع نہیں ہوتی، اپنی بھلائی، برائی خود سوچتی ہے۔ اس کے برخلاف عقلِ مسلم سے وحی کا انداز خطاب استصلاح کے طریقہ پر ہوتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ عقلِ مسلم سے وحی اسی طرح مخاطب ہوتی ہے جس طرح

استاد شاگرد سے۔ استاد شاگرد کے باہمی تعلق کی اساس شاگرد کی جانب سے اس اعتراف پر اور استاد کی جانب سے اس شعور پر ہوتی ہے کہ شاگرد کی بھلائی اور تکمیل ذات کے طریقوں کو خود شاگرد کی بہ نسبت استاد بہتر سمجھتا ہے۔ شاگرد کی عقل کا کام یہ ہے کہ وہ استاد کے اوامر و نواہی پر غور کرے، استاد کی بتائی ہوئی راہوں پر چلے اور بالآخر ذکاوت، اخلاص اور کثرت ممارست سے وہ حس اور ملکہ پیدا کرے کہ استاد کی عدم موجودگی اور سکوت کی حالت میں بھی استاد کی مرضی معلوم کر سکے اور اس کے بموجب عمل پیرا ہو۔ یہ کوئی ایسی مبہم، غیر یقینی یا نادر بات نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کا تجربہ ہوگا کہ صریح ہدایت نہ ہونے کے باوجود ہم جان لیتے ہیں کہ ہمارے استاد ہمارے لیے کیا پسند کرتے ہیں۔ بہت سے خادم اور ماتحت بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مخدوم کسی ایک نئی بات سے جو پہلے تجربہ میں نہ آئی ہو خوش ہوں گے یا ناخوش۔ حد یہ ہے کہ غیر مخلص، مطلب پرست چاپلوس اور خوشامدی بھی اس حس اور ملکہ سے خوب کام نکالتے ہیں۔ شرط صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنی عقل کو اپنے سے بلند ہستی کی وحی، توجیہ، اور اشارے سمجھنے میں لگائیں نہ یہ کہ اپنی وقتی پسند، خوشی اور آسانی کے مطابق خود اپنی راہ نکالیں۔ بحیثیت استاد میرا تجربہ ہے اور دیگر اساتذہ میری تصدیق کریں گے کہ کبھی کبھی ایک طالب علم اپنی عقل سے یہ فیصلہ کر کے آتا ہے کہ اس کی بھلائی اسی سال امتحان دینے میں ہے، میں بحیثیت استاد اس سے یہ کہتا ہوں کہ تم اس سال امتحان نہ دو، تمھاری بھلائی اس میں ہے کہ ایک سال اور محنت کر کے اور اپنی خامیاں پوری کر کے آیندہ سال امتحان دینا۔ یہ طالب علم رسمی طور پر میرا شاگرد ہے، عقل بھی رکھتا ہے میں خود اس کی تیزی اور زیرکی کا معترف اور قدردان ہوں لیکن وہ اپنی عقل کو میرے امر و نہی کے سمجھنے کے لیے وقف کرنے کے بجائے خود رائی کی تدابیر نکالنے میں صرف کرتا ہے۔ یہ مثال ہے عقل غیر مسلم کی۔ میں اپنے بعض رفقائے کار کو دیکھتا ہوں کہ وہ ایسی عقل غیر مسلم کی بغاوت سے ڈر کر اپنے امر و نہی میں ترمیم کر دیتے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جس سے آئے دن ڈرایا جاتا ہے کہ اگر مذہب میں ترمیم نہ ہوئی تو موجودہ نسل اور موجودہ نہیں تو آیندہ نسل تو ضرور دین و مذہب چھوڑ بیٹھے گی۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا طالب علم ہے جو اپنی عقل سے کوئی فیصلہ کیے بغیر مجھ سے ہدایت لینے آتا ہے کہ ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں اسے جو ہدایت کرتا ہوں اسے کمال طاعت کے ساتھ گرہ میں باندھ لیتا ہے، اپنی عقل کو میری ہدایت پر غور و خوض میں لگا دیتا

ہے یہاں تک کہ اس کی علت اور مصلحت کو خوب سمجھ لیتا ہے۔ اور نہ صرف اس معینہ صورت میں اس پر عمل کرتا ہے بلکہ دیگر مماثل حالات میں بھی میری مرضی اور منشا کو پورا کرتا ہے اور خواہ دوسرے طالب علم اتفاقی طور پر زود تر کامیابی حاصل کرتے نظر آئیں اسے یقین رہتا ہے کہ اس کی فلاح میری ہدایت پر چلنے میں ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "أيحسب الانسان ان يترك سدى"۔۔۔ انسان کے شتر بے مہار کی طرح ہونے کے معنی یہی ہیں کہ وحی کو اولیت دیے بغیر تمام تر اپنی عقل پر بھروسہ کرے، عقل ہی کو معیار قرار دے۔ ایسے انسان کو حقیقت میں وحی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا لیکن معاشرہ کے دباؤ اور اخلاقی جرأت کی کمی کے باعث وحی سے ناطہ توڑ بھی نہیں سکتا اس لیے عقل ہی کی زیرکی سے کام لے کر عقل کے فتویٰ کو مذہب پر نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس عقلِ بے مہار (یا عقلِ بے عقال) کے مقابلہ میں "عقلِ مسلم" کا دائرۂ عمل اور طریق کار دونوں بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ عقلِ مسلم کا دائرۂ عمل صرف فقہ ہوتا ہے یعنی نصوص کا علم و فہم اور ان سے استنباط احکام، مماثل حالات میں قیاس اور جہاں نص موجود نہ ہو وہاں دین کے اقتضا کی بابت تحرّی اور اجتہاد۔ یاد رہے کہ دین کے اقتضا کی بابت تحرّی اور اجتہاد محض عقلی کاوش سے بالکل مختلف ہے۔

اس کو یوں سمجھیے کہ ایک مسلم جسے سمت قبلہ معلوم نہیں وہ کیا کرے گا؟ اگر وہ ایسی صورت میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے کہ جس سمت اس کا دل چاہے یا جس سمت کھڑا ہونا اس کو خوش گوار اور آرام دہ معلوم ہو اس سمت نماز پڑھ لے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عقل نے رسی تڑا لی اور وہ پھر بے مہار ہو گئی۔ یہ تحرّر ہے۔ اور اگر وہ سمتِ قبلہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں بھی اپنے آپ کو سمت قبلہ کا پابند سمجھتا ہے تو وہ اپنی مرضی اور آرام سے قطع نظر عقل کی کاوش اور کوشش اس میں صرف کرے گا کہ سمت قبلہ کس طرف ہو سکتی ہے۔ اس طرح عقل بدستور مُسلم رہے گی اور اس کا نام "تحرّر" نہیں بلکہ "تحرّی" اور اجتہاد ہوگا۔

یہاں جزئیات میں نہیں پڑنا، صرف عام ذہنیت اور رجحانات سے بحث ہے۔ یہی رجحان جس کو ابھی "تحرّی" کا نام دیا گیا اس کا ایک شاخسانہ یہ ہے کہ دین کے اداروں کی ہیئت ـــــ مثلاً زکوٰۃ اور قطع ید کی ہیئت ـــــ بھی دیوارِ زنداں معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس ہیئت کی مخاطب صرف "عقلِ مسلم" ہے، اس کی مخاطب عقلِ محض ہو ہی نہیں سکتی۔ جب یہ ہیئت دیوارِ زنداں معلوم ہونے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ "عقلِ مسلم" معلّقہ بن کر رہ گئی ہے اور عقلِ محض پس پردہ کارفرما ہے۔ یہ عقلِ محض ہی تو

ہے جو یہ بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں غیر اسلامی افکار کے فیشن شو (Fashion Show) میں شمولیت کے لیے ہیئت بدلنا ضروری ہے، اور ہیئت میں رکھا کیا ہے؟ تمام اسلامی اداروں اور اسلامی احکام کے ساتھ وہی عمل کرو جو ایک ماہر کیمیا اپنی تجربہ گاہ میں کیا کرتا ہے۔ ان اداروں یا احکام سے ان کی روح اور ان کی قدار کو جدا کرو اور پھر انھیں وہ شکل و ہیئت دید و جو زمانہ حال میں مقبول ہو۔ مسلمان کے مسلمان رہو گے اور "ماڈرن" بھی بن جاؤ گے، اپنے بھی خوش رہیں گے اور غیروں کی محفل میں بھی باریابی کا شرف حاصل ہو گا۔ یاد آیا کہ قدیم فلسفیوں کا ایک گروہ تھا جو اپنے وجود میں بھی شک کرتا تھا۔ مسلم فلاسفہ ان سے تنگ تھے۔ خود اپنے وجود کی دلیل دوسروں سے مانگتے تھے اور جو بھی دلیل دی جائے اس کا انکار کر دیتے تھے۔ بالآخر ایک منچلے جلیلے نے یہ تجویز کی کہ انھیں خوب پیٹا جائے یہاں تک کہ یہ چلا اٹھیں: "میں ہوں اس لیے کہ میں چوٹ کی تکلیف محسوس کرتا ہوں۔" یہ علاج کہیں زیادہ کارگر تھا اس علاج بالنفس سے کہ "میں ہوں اس لیے کہ میں فکر کرتا ہوں۔" ان روح نکالنے والوں سے بھی کوئی پوچھے کہ اگر آپ کی روح آپ کی جسمانی ہیئت سے جدا کر دی جائے تو آپ کہاں رہیں گے؟ خیر! یہ تو مناظرانہ جواب تھا۔ ٹھنڈے دل سے کہنے کی بات یہ ہے کہ اسلام کی اقدار تو وہی کی وہی ہیں جو عقلِ محض، عقلِ سلیم دعوت قبول کرنے سے قبل، سے اپیل اور ابھرتی ہیں، انسان کی فطرت میں خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اسلام اور عقلِ محض یا فطرتِ انسانی میں بھی ویسا ہی تصادم نظر آئے جس کی مثالیں بعض دوسرے مذاہب میں ملتی ہیں۔ مگر اسلام تو دینِ فطرت ہے "فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا۔" اسلامی اقدار کا فطرت انسانی کے عین مطابق ہونا تو خود اسلام کے دعویٰ کے بموجب ضروری ہے۔ پھر اسلام کی ضرورت کیا؟ عقلِ محض ہی کیوں کافی نہ ہو؟ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام عقلِ انسانی کی جو مدد کرتا ہے وہ صرف اتنی ہے کہ ان اقدار کے لیے جو فطرتِ انسانی میں ودیعت کی گئی ہیں، عمل کی ایک مخصوص شکل و ہیئت پیش کرتا ہے۔ اقدار تو عقلِ محض کے لیے اجنبی نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ کسی کی گرفت ان پر نسبتاً مضبوط ہو اور کسی کی ڈھیلی۔ البتہ عقلِ محض ہمیشہ سے اسی میں سرگرداں اور ناکام رہی ہے کہ ان اقدار کو انسان کی عبادات، معاملات اور پوری کی پوری ظاہری اور باطنی زندگی میں کیا منظم اور جامع شکل و ہیئت دی جائے۔ مثال کے طور پر چوری عقلِ انسانی کے نزدیک قابلِ سزا ہے۔ جو چوری کرتا ہو وہ بھی اپنے آپ کو چور کہلانا پسند نہیں کرے گا۔ یہاں تک کہنا چاہیے کہ اسلام عقلِ سلیم کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ جہاں عقل کے پر جلنے لگتے

ہیں اور اسلام آگے بڑھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مکمل ضابطۂ حیات میں اس جرم کی وضع، اس کا درجہ اور اس درجہ کے مطابق اس کی سزا اور سزا کی نوعیت اور سادہ اور عام فہم حد معین کرتا ہے۔ ایک اور مثال لیجیے: غنی کا زائد از حاجت دولت سے فقیر کی حاجت روائی کرنا ایک فطری انسانی جذبہ ہے عقل کے نزدیک مستحسن ہے، لیکن چونکہ عقل مکمل ضابطۂ حیات میں اس کی شکل معین کرنے سے عاجز ہے، اسی لیے یہ جذبہ بسا اوقات عملی طور سے غیر فعال اور بے کار ہو جاتا ہے اور بہت نیچے دب کر جب پورے زور سے ابھرتا ہے تو کمیونزم جیسی شکلیں اختیار کر لیتا ہے، جسے کہنا چاہیے کہ اس انسانی جذبہ کی غلط تفسیر ہے۔ اسلام اس فطری جذبہ کو، اس انسانی قدر کو، اس عقل سلیم کے تقاضے کو ایک سادہ مگر نہایت ہی واضح اور عام فہم شکل و ہیئت دیتا ہے، جس کی تعیین میں یہ امر ملحوظ ہے کہ وہ سارے نظامِ حیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ اب سوچیے کہ اعمال اور ضابطۂ حیات کی ہیئت اور شکل بدل دینے سے اسلام اور وحی کا حصہ تو ختم ہو گیا، باقی جو رہ گیا وہ عقل محض اور سادہ فطرت کا حصہ ہے، جو دین تو دین دنیا کی فلاح کے لیے بھی ناکافی ہے۔

ایک اور طریقہ سے دو ذہنیتوں کا فرق دیکھا جا سکتا ہے: ایک ذہنیت صحابہ کی تھی جو ہر موقع پر کہا کرتے تھے، افسوس رسول اللہ سے یہ نہ پوچھ لیا وہ نہ پوچھ لیا، یعنی وہ اعمال کی ہیئات و اشکال کی تعیین میں وحی کی مدد کے مزید طالب تھے، دوسری ذہنیت اس بیسویں صدی میں ہماری ہے کہ جو ہیئات و اشکال خدا کی طرف سے ہمیں دی گئی ہیں ان سے دل تنگ ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ ہیئات و اشکال بھی معین نہ ہوتیں اور اسلام کنفیوشش کی تعلیمات کی طرح صرف مبہم اقدار کا مجموعہ ہی رہتا، تو کیسا اچھا ہوتا، پھر ہم کیسے آزاد ہوتے۔ چونکہ ان ہیئات و اشکال کی تعیین ثابت ہے اور تیرہ صدیوں نے ان پر اعتراف کی مہر ثبت کر دی ہے اس لیے اب ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہیئات و اشکال قرونِ اولیٰ کے لیے تھیں، ہمارے لیے نہیں۔ یہ وہی "تحریر" ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ سارا عذر یہ ہے کہ ہمیں بیسویں صدی میں رہنا ہے اور اس زمانے کے رجحانات کا ساتھ دینا ہے۔ اچھا تو اس زمانے کے رجحانات کیا ہیں؟ سائنس کی ترقی، صنعت، تجارت۔ رہی جمہوریت تو اس کا بھاؤ تو آج کل گرا ہوا ہے، اس کی بھی قدر ہی باقی رہ گئی ہے، شکل و ہیئت تو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مختلف ممالک میں بیسیوں بار بدلی اور اب بھی آئے دن بدلتی رہتی ہے، سوشلزم سے ابھی آنکھ لڑی ہے "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟" ـــــ اچھا تو

کوئی بتائے کہ سائنس کی ترقی کے لیے اسلامی نظام حیات کی کونسی اشکال و ہیئات میں تبدیلی ضروری ہے؟ سائنس علم ہے، علم کا دشمن چاہتا ہے، خدا ہمیں بھی توفیق دے۔ نظام چاہے امریکہ کا ہو، چاہے روس کا۔ چاہے ماؤزے تنگ کا ہو، چاہے چیانگ کائی شیک کا، اور ہاں چاہے میکاڈو کے جاپان کا، جس نے جتنی محنت کی اس نے اتنی علم میں ترقی کی، اگر آج ہم سائنس میں پیچھے ہیں تو اس کے ذمہ دار تمام تر ہمارے سائنس دان ہیں نہ کہ مولوی ملا۔ تقریباً پندرھویں صدی تک سائنسی علوم کی مشعل ہمارے ہاتھ میں تھی اور اس وقت تک ہم نے اسلامی نظام حیات میں علوم کی ترقی کی خاطر کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہمارے سائنس دان صرف ایک رخصت کے طالب ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ انھیں اسلامی علوم سے، قرآن حدیث سے معاف کر دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے انیسویں صدی کے لائق صد تعظیم و تکریم علما[1] یہ رخصت دینے کو تیار نہ تھے لیکن انگریز نے نہ صرف سائنس دانوں کو بلکہ ہر "تعلیم یافتہ" مسلمان کو اسلامی علوم سے رخصت دلا ہی دی۔ سرسید کو صرف ایک فکر تھی اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو حکومت اور سیاست میں وہ مقام مل جائے جو ایک مستقل قوم کے شایان شان ہو اور ان کے ساتھ وہ سلوک نہ ہو جو ایک ناکارہ اور مداح اقلیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس مقصد کی خاطر انھوں نے بھی اسلامی علوم سے رخصت دینا گوارا کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اسلامی علوم کی تلافی اسلامی تربیت سے ہو جائے گی۔ انھوں نے خلوص اور نیک نیتی سے جو چاہا تھا وہ تو اللہ نے پورا کر دیا اور علی گڈھ کی بدولت مسلمانوں کو حکومت میں مناصب ملے اور سیاست میں پاکستان ملا۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور یہ سراسر غلط تھا ہی کہ علم کی تلافی کسی درجہ میں بھی تربیت سے ہو سکتی ہے۔ تربیت علم سے فائدہ اٹھانا سکھاتی ہے علم کی جگہ تو نہیں لے سکتی، چنانچہ اسلامی علوم سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ محروم رہا۔ شبلی کو اس کا اندازہ تھا اور اکبر کی دوررس نگاہ تو وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو آج پیش آ رہا ہے:

شکر ہے راہ ترقی میں اگر بڑھتے ہو　　یہ تو بتلاؤ کہ قرآں بھی کبھی پڑھتے ہو؟

---

[1] یہ علماء وہ ہیں جنھوں نے انگریزی پڑھی، عبرانی پڑھی، توراۃ پڑھی، انجیل پڑھی اور علمی سطح پر عیسائی پادریوں کو شکست فاش دی۔ انھوں نے عملی سیاست میں گراں قدر حصہ لیا۔ دینی تعلیم اور اسلامی علوم کے حق میں جدید انگریزی تعلیم کے جن نتائج و عواقب کی انھوں نے پہلے روز پیشین گوئی کی تھی وہ سو فی صدی صحیح ثابت ہوئی۔

دین کو سیکھ کے دنیا کے کرشمے دیکھو مذہبی درس "الف بے" ہو علیگڑھ "تے" ہو

یہ بات تو کھری ہے، ہرگز نہیں ہے کھوٹی عربی میں نظم ملت بی۔ اے میں صرف روٹی
لیکن جناب لیڈر یہ شعر سن کے بولے بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی
اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے کس کی نظر ہے خائر کس کی نظر ہے موٹی

الغرض ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو گیا کہ ہمارے سائنس دان علوم اسلامیہ سے بے بہرہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں قوم کا نقصان ہے یا فائدہ۔ لیکن اتنا تو ہے کہ اگر ہمارے سائنسدان کمال پیدا نہ کر سکیں تو ان کے لیے دین، مذہب یا مولوی ملا کے سر الزام دھرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی جب تک ہمارے سائنس دان علوم اسلامیہ سے بے بہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے تعلق بھی تھے اس وقت تک کم از کم ان کی دیانت داری کا بھرم تھا، لیکن گذشتہ بیس سال سے یعنی قیام پاکستان کے بعد سے ہمارے سائنس دانوں کو بھی یہ شوق ہوا ہے کہ وقتاً فوقتاً اپنے معمل اور تجربہ گاہوں کے حدود سے نکل کر اسلام کی آبیاری اور سرپرستی کریں۔ دراصل پاکستان میں اسلام کی حیثیت ایک یتیم مگر مال دار بچے کی ہے جس کا متولی اور سرپرست بننے کا ہر ایک ہی خواہش مند ہے۔ لیکن اس دوڑ میں سائنس دان کے شریک ہونے سے سائنس کے وقار کو بٹہ لگتا ہے۔ ہم غیر سائنس دان سائنس کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اس لیے کہ اس میں اٹکل پچو باتوں کی اور خیال آرائی اور لاف زنی کی گنجائش نہیں، اسی لیے ہم کبھی سائنس کی حدود میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتے اور اگر بے غیرتی لاد کر کبھی جرأت کر بھی بیٹھیں تو سائنس کے پاسبانوں سے امید نہیں کہ وہ ذرا بھی مروت اور رواداری سے کام لیں گے۔ اس کے مقابلہ میں جب سائنس دان اسلام کے حدود میں سرگشت کو نکل آتے ہیں تو انھیں دیکھ کر سب سے پہلے سائنس کے ساتھ ان کی وفاداری میں شک ہونے لگتا ہے۔ جو سائنس دان بغیر علم کے کسی بھی مسئلہ پر بولے اس کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس نے سائنس کا پہلا سبق بھی نہیں سیکھا۔ کہتے ہیں اور بار بار اسی کو دہراتے ہیں کہ اسلام مطالعۂ کائنات اور تسخیر کائنات پر زور دیتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ توجیہ دعوت کے مرحلہ میں اسلام انسان کے اس فطری رجحان کا واسطہ دیتا ہے اور اس سے ہدایت کا راستہ نکالتا ہے قبول دعوت کے بعد بھی اسلام انسان کے اس فطری رجحان کو آزاد چھوڑتا ہے اور چونکہ مادہ کوئی گھناؤنی

چیز نہیں، دنیا کی آسائشیں اللہ کی نعمت ہیں اور ان سے جائز حدود میں تمتع بندہ کی طرف سے اللہ کے شکر کا موجب ہوتا ہے اور شکر اللہ کی طرف سے زیادتی کا ارمغان لاتا ہے، اس لیے اجازت ہے بلکہ پسندیدہ اور مستحب ہے کہ تسخیر کائنات کرتا چلا جائے اور جہاں تک تسخیر کائنات سے پیدا ہونے والی فوجی مسلح طاقت کا تعلق ہے تو وہ تو فرض ہے کہ اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ لیکن مطالعہ کائنات اور تسخیر کائنات تو انسان کی فطرت میں ہے، اگر کوئی دین مذہب اس پر قدغن لگائے بھی تو انسان اس دین مذہب کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے، پھر اس کے لیے عقل انسانی بالکل کافی ہے۔ وحی سائنس نہیں بلکہ مکارم اخلاق کی تتمیم اور تکمیل کے لیے آئی ہے۔ چنانچہ وحی مطالعہ کائنات کی طرف شوق دلانے والے اور معنی خیز مفید مطلب اشارے کر کے آگے بڑھ جاتی ہے، اور قبول دعوت کے بعد وحی تمام تر اہتمام کتاب اللہ کی تعلیم کا کرتی ہے جو کہ زندگی کی غایت اصلی ہے۔ قرآن کے مجموعی نظام میں کتاب فطرت کی حیثیت وہی ہے جو قصیدہ میں تشبیب کی ہوا کرتی ہے۔ کتاب اللہ کا درجہ مدیح یا قصیدہ کے مقصد اصلی کا ہے۔ قبول دعوت گویا کہ مخلص یا گریز ہے۔ چنانچہ جیسے ہی حس فطرت کے ذکر سے سامع کی توجہ حاصل ہوتی ہے اس کے سامنے اللہ کا ذکر اور اس کا کلام رکھ دیا جاتا ہے اور یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ اللہ کے کلام کو پڑھے، اسے سمجھے، اس میں غور و فکر کرے، استنباط احکام کرے اور دنیا میں شریعت نافذ کرے۔ ہمارے سائنس دان جو سنی سنائی ادھوری بات سے اڑتے ہیں اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ یہ تاکید کرنے کے لیے ہی نازل کی گئی تھی کہ کبھی کتاب اللہ نہ پڑھنا سیرت کو سنوارنے کی فکر نہ کرنا، بس مطالعہ کائنات اور تسخیر فطرت میں لگے رہنا۔ اللہ کی اطاعت صرف اس میں ہے کہ چاند پر پہنچ جانا، چاند پر قرآن لے کر جانے سے حاصل؟ کیا سائنس دانوں کی ساری جد و جہد اس لیے ہے کہ وہاں علمائے دین آباد کیے جائیں جو اس زمین پر بار دوش ہیں؟ کوئی میری باتوں کو ہذیان نہ سمجھے۔ سب کو یاد ہونا چاہیے کہ ہمارے متعدد سائنس دان متعدد بار منبر عام سے یہ کہہ چکے ہیں کہ اگر پاکستان کی فلاح مطلوب ہے تو نہ صرف اسلامی علوم بلکہ تمام آرٹس کے شعبوں میں تالے ڈال دینا چاہیے۔ یہ عقل کی رعونت بھی ہے اور بہانہ تراشی بھی۔ اس رعونت کے ساتھ جب کوئی اپنے مقاصد کے لیے اسلام کو بیچ میں لائے تو اسے مصلحت پرستی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

اسی ذیل میں یہ کوشش بھی کی جاتی ہے کہ قرآن میں جو "الحکمۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے اسے سائنس کے

مرادف قرار دیا جائے۔ قرآن کو علوم طبیعیہ کی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں۔ قرآن تو کتاب کے ساتھ اخلاق کی عملی تربیت کا اہتمام کرتا ہے۔" الحکمۃ" سے یہی مراد ہو سکتی ہے اور ہے۔

سب تو نہیں، بعض سائنس داں (اور غیر سائنس داں ماہر تعلیم بھی) اس پر اترآتے ہیں کہ سائنس میں ترقی نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنا رکھا ہے۔ انگریزی کی جگہ لینے کے لیے جو بہت سی ملکی زبانیں تیار ہیں اور ہو رہی ہیں ان میں سے صرف اردو کو لیجیے۔ ہمارے بعض مصلحت پرست اور سیاست آشنا ماہر تعلیم جو خود کبھی اردو کو (ہلکی پھلکی جذباتی تقریروں کے علاوہ) علمی اغراض کے لیے استعمال نہیں کرتے وہ تو یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اگر اردو کے اسلامی لٹریچر کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور عربی، فارسی، ترکی تینوں زبانوں کے مجموعی اسلامی لٹریچر کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اردو کا پلڑا بھاری رہے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو کبھی اسلامیات کا ادنیٰ طالب علم بھی نہ رہا ہو اور جو عربی سے نابلد ہو وہ اس حد تک جرأت کرے اور، جاہل عوام کا تو ذکر کیا، پڑھے لکھے سنجیدہ لوگ اس کی اجازت دیں[1] اور خاموشی سے سنیں (ہو سکتا ہے کہ داد بھی ہوئی ہو) تو سمجھ لینا چاہیے کہ ملک میں علمی قدریں بالکل ہی پامال ہو چکی ہیں —— ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم ..... ——

بہت زیادہ حسن ظن اور حسن تعلیل سے کام لیا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ عربی قرآن ایک ہے اور ایک ہی رہے گا، اس کے مقابلہ میں اردو تراجم کے انبار کو رکھا جائے تو یقیناً اردو کا پلڑا بھاری رہے گا۔ اس سے قطع نظر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہماری چودہ سو سالہ تاریخ میں ساڑھے بارہ سو سال تک عرب، ایران و ماوراء النہر اور ترکی کی علمی زبان عربی رہی، مقامی زبانوں کو عربی سے انتساب پر فخر رہا۔ خود ہندوستان میں انگریزوں کی آمد تک اردو کسی مدرسہ میں پڑھی پڑھائی نہیں گئی، علم کی اور ساری نصابی کتب کی زبان عربی اور صرف عربی تھی۔ پھر یہ تو بدیہی بات ہے کہ اگر اسلامیات کی پشوازاتار کر اسے "اسلامی نظریۂ حیات" کا سایہ[2] نہ پہنایا جائے تو قرآن، حدیث

---

[1] چند روز ہوئے ایک مشاعرہ میں محسن بھوپالی کا ایک شعر سنا تھا جو رہ رہ کر یاد آتا ہے:

محسن ورودِ کم نظراں سانحہ نہیں — یہ سانحہ کہ اہل نظر دیکھتے رہے

[2] پہنا سے سایہ مری جاں اتار کر پشواز — زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

فقہ، تفسیر کی تعلیم عربی کے بغیر کسی اور زبان میں ہو ہی نہیں سکتی۔ جب اسلامیات کے بازار میں اردو کے سودیشی کھدر کا چلن ہوا اور کم نظروں کو آنکھیں ملانے کا موقع ملا اس وقت اہل نظر نایاب اور معدوم نہ تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

"یہ آفت جو اس جزو زمان میں تمام دیار ہندوستان خصوصاً شاہ جہان آباد حرسہا اللہ عن الشر و الفساد میں مثل ہوائی وبائی کے عام ہوگئی ہے کہ ہر عامی اپنے تئیں عالم اور ہر جاہل آپ کو فاضل سمجھتا ہے اور فقط اسی پر کہ چند رسالہ مسائل دینی اور ترجمہ قرآن مجید کو اور وہ بھی زبان اردو میں کسی نے استاد سے اور کسی نے اپنے زور طبیعت سے پڑھ لیا ہے، اپنے تئیں فقیہ و مفسر سمجھ کر مسائل و وعظ گوئی میں جرأت کر بیٹھتا ہے۔ . . . . . .

(آثار الصنادید، حالات مولوی شاہ عبدالعزیز)

اس سودیشی کھدر کا چلن محض افلاس علم کے سبب ہوا۔ بعد کو مغربی اثرات کے تحت غیر اسلامی قومیت نے جنم لیا تو ادعائے عقل نے افلاس علم کو سہارا دیا، اس وقت سے کم نظر آنکھیں دکھانے لگے اسی غیر اسلامی قومیت کے شاخسانہ کے طور پر گذشتہ ایک صدی کے دوران ایران اور ترکی میں زبان کے بارے میں جو تحریکیں چلیں وہ اب تاریخ کا جزو بن چکی ہیں اور ان کے اسباب و محرکات اور عواقب و نتائج کا بآسانی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں اس وقت جو یہ کہا جا رہا ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے اردو کا پلڑا بھاری ہے اور اس کو عربی پر فوقیت حاصل ہے، اس کا ان تحریکات سے مقابلہ کر کے دیکھ لیجیے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایران اور ترکی میں عربی سے نفرت کی وجہ وطن اور نسل تھی اور ہمارے یہاں عربی سے پیچھا چھڑانے کی وجہ اسلام بتائی جاتی ہے۔ پاکستان کا خمیر ایسا ہے کہ ہر اجنبی فکر یہاں داخل ہونے سے پہلے اسلام کا بھیس بدلنے پر مجبور ہے۔ یہ عقل کی روباہی اور عیاری ہے۔

عربی زبان کا چودہ سو سالہ ذخیرہ جو تمام عالم اسلام کی مختلف قوموں کی بہترین کوششوں کا مرہون ہے اس کے مقابلہ میں صرف ایک سو سال میں اردو میں جو کچھ ہوا ہے اس میں قابل قدر انہی علما کا کارنامہ ہے جن کی ثقافت عربی تھی۔ آخر آخر میں عربی سے جہل، استغنا اور عناد کی جو کچھ پیداوار ہے وہ باعث شرم و باعث ننگ ہے۔ انگریز بھی کلاسیکی زبانوں کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا، عربی فارسی کے ساتھ اس نے ہمیشہ وہ احترام ملحوظ رکھا جو کلاسیکی زبانوں کا حق ہے، اس کی قدر اس وقت معلوم ہوتی

ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ آزادی کے بعد سے ہم نے ان زبانوں کی کیا گت بنائی ہے۔ مختصر یہ کہ اقبال کی قدردانی اور وفاداری کا دم بھرنے کے باوجود اگر اردو کے طالب علم سے "اسرارِ خودی" پڑھنے کو کہا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ معلّی کی دیوار میں شگاف پڑ گیا۔ غالب کی عظمت پر کس کو ناز نہیں؟ جشن کی دھوم دھام قریب ہے۔ گستاخی معاف، کوئی پوچھے کہ اردو کے "موحّدین"[۵۱] میں کتنے ایسے ہیں جنھوں نے "نقشہائے رنگ رنگ" کی ایک جھلک بھی دیکھی ہے۔ جو ہیں وہ اسی عہد غلامی کے خطا کار ہیں جس کی طرف ابھی اشارہ ہوا۔ الغرض ایک طرف تو اردو کی جڑیں کاٹ کر اسے اس کی توانائی کے کلاسیکی سرچشموں سے جدا کیا جاتا ہے دوسری طرف اس سے ایک علمی زبان کی خدمت لینے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے یہ تضاد صرف ایک کوتاہ اندیشی اور تنگ خیال قومیت کی سیاسی خود غرضیوں سے میل کھاتا ہے۔ اگر ہمارے سائنس دان کوئی مخلصانہ علمی نقطۂ نظر رکھتے ہیں تو انھیں یہ ماننا پڑے گا کہ اردو کو علمی زبان اور اعلیٰ مدارج میں ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اردو نہیں بلکہ عربی فارسی کی باقاعدہ تعلیم کو عام کیا جائے۔[۵۲] عقل کے کردار سے بحث کرتے وقت یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ تنہا عقل اندھی عصبیتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی یہاں تک کہ اہل علم کو غیر علمی موقف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ عقل کو تعصبات سے داور موجودہ دور کی قومیت سب سے بڑا تعصب ہے، بچانے کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے دین یا رومی کی اصطلاح میں "عقلِ عقل"۔

صنعت، حرفت اور تجارت کوئی نئی چیز نہیں، ہمیشہ سے رہی ہے اور برابر ترقی کرتی آئی ہے۔ ترقی کے بالکل ابتدائی درجہ میں جوں ہی انسان نے تمدن و حضارت کی راہ لی "تمویل" کا مسئلہ پیش آیا یعنی یہ کہ ایک فرد کے بس کی یہ بات نہیں رہی کہ صنعت، حرفت اور تجارت کو اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانہ پر فروغ دینے کے لیے جتنے سرمایہ کی ضرورت پڑے وہ اس کا تن تنہا کفیل ہو جائے۔ لامحالہ اسے دوسروں سے مال کے

---

۵۱ "موحّدین" وہ جو اردو کے ساتھ عربی فارسی کو شرک سمجھتے ہیں۔ انگریزی کی دشمنی پر ان کی سیاست کی بنیاد ہے اور انگریزوں کے ساتھ دفاع مشترک (Joint Defence) کا معاہدہ بھی ہے۔

۵۲ پاکستان میں جو لسانی رقابتیں بالائے سطح یا زیر سطح پائی جاتی ہیں ان کا واحد علاج یہ ہے کہ کلاسیکی زبانوں (عربی فارسی) کا اقتدار اعلیٰ بخش جائے جو دین، ثقافت، تاریخ ہر لحاظ سے ان کا حق ہے۔

حصص جمع کرنے پڑتے ہیں۔ انسان کی خود غرضی کا یہ حال ہے کہ اگر وہ دوسرے انسان کو اس کی ذاتی حاجت روائی کے لیے کچھ قرض دیتا ہے تو اس میں بھی "ربوا" بڑھت کا طالب ہوتا ہے۔ تنہا عقل سے آج بھی پوچھ کر دیکھ لیجیے وہ اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی۔ پھر اگر "مُقرِض" (قرض دینے والے) کو یہ معلوم ہو جائے کہ "مُقترِض" (قرض لینے والا) اس کا مال صنعت، حرفت یا تجارت میں لگائے گا تو وہ تو بالطبع یہی چاہے گا کہ جتنا نفع ہو اس میں سے زیادہ سے زیادہ حصہ خود اس کو ملے اور مقترض کارندہ کم سے کم پر راضی ہو جائے۔ لیکن "خُلق الانسان ھلوعا" انسان بڑا تھڑدلا بھی واقع ہوا ہے۔ وہ صنعت، حرفت، تجارت کا نفع دیکھ کر منہ پھاڑتا ہے، لیکن نقصان میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔ مقرض کو جو نقصان کا ڈر ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ سرمایہ لگانے سے ڈرتا اور جھجکتا ہے اسے وہ مقترض کارندہ بھانپ لیتا ہے جسے اپنی کامیابی پر کسی حد تک بھی وثوق ہو۔ چنانچہ وہ مقرض سے کہتا ہے کہ تم منافع میں کم سے کم حصہ پر راضی و قانع ہو جاؤ تو میں تمھیں نقصان کے ڈر سے نجات دیے دیتا ہوں۔ مقرض اپنی پست ہمتی کے باعث اس پر راضی ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا خود اپنا منصوبہ الٹ جاتا ہے۔ بالآخر مقترض کارندہ جو کچھ کماتا ہے اس میں سے بہت تھوڑا حصہ بطور سود کے مقرض کو دے دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مقترض کارندہ مقرض کو جو بندھا ٹکا "سود" دیتا ہے وہ اس منافع کا بہت تھوڑا حصہ ہوتا ہے جو وہ مقرض کے مال اور اپنی محنت اور حسن تدبیر سے کماتا ہے۔ لطف یہ کہ مقترض کارندہ تو خوش ہوتا ہی ہے، مقرض بھی یہ سمجھتا ہے کہ نقصان میں شریک نہ ہو کر اس نے مقترض کارندہ کو بے وقوف بنایا اور خود بے وقوف بن کر خوش ہوتا ہے۔

اس کے باوجود بھی مقرض کو اطمینان نہیں ہوتا۔ وہ یہ ڈرتا ہے کہ مقترض کارندہ ہزار یقین دلائے، اگر نقصان ہوا اور وہ دیوالیہ ہو گیا تو میرا تو مال ڈوب جائے گا۔ پھر کیا ضمانت ہے کہ مجھے اپنا راس المال پورا پورا مع سود کے مل سکے گا، اور کہاں سے ملے گا، اور اس کے لیے مجھے کتنے جھنجٹ میں پڑنا ہوگا اور کتنی پریشانی اور کوفت اٹھانی ہوگی؟ اُدھر مقترض کارندہ کی ضرورت اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتا اور چھوٹے چھوٹے سینکڑوں مقرضین سے فرداً فرداً معاملہ کرنا اس کے لیے دشوار ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ کوئی ایک بڑا سرمایہ دار ایسا مل جائے جو "سود" نسبتہً زیادہ لے تو لے اس کی تمام ضرورتیں وقت پر پوری کر دے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر زیرک بنک کار درمیان میں کود

پڑتا ہے اور اپنی دکان سجاتا ہے۔ ایک طرف وہ مقرضین کو اپنے وعدوں کی ہر مطلوبہ ضمانت پیش کرتا ہے، حکومت سے تصدیق اور یقین دہانی کراتا ہے یہاں تک کہ قرض دینے والے کو کوئی کھٹکا باقی نہیں رہتا۔ دوسری طرف وہ مقترض کارندہ سے ایسی ضمانت لے لیتا ہے کہ اسے خود قرض دینے میں اپنے راس المال یا سود کے بارے میں کسی نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔ پھر وہ دھڑا دھڑ چھوٹے چھوٹے مقرضین سے چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض لیتا ہے اور بڑے بڑے مقترضین کو بڑی بڑی رقمیں کھٹا کھٹ قرض دیتا ہے مقترضین سے زیادہ شرح سود لیتا ہے اور مقرضین کو بہت کم شرح سود دیتا ہے۔ سود لینے اور سود دینے کی شرح کا فرق خود اینٹھ لیتا ہے۔ اس کے باوجود دونوں ہی اس کے شکر گزار اور احسان مند رہتے ہیں۔ بالآخر وہ تمویل کا مرجع بن کر صنعت، حرفت اور تجارت کی شہ رگ دبائے رکھتا ہے۔

ہو سکتا ہے کوئی اقتصادیات کا ماہر زیر لب مسکرائے اور کہے کہ آپ نے بھی سادگی کی حد کر دی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرا اقتصادیات کا مطالعہ بہت سرسری ہے لیکن شاید یہ صحیح ہو کہ شریعت میں اس مسئلہ کے جن پہلوؤں کی رعایت کی گئی ہے وہ یہی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اگر ایک انسان دوسرے انسان کو اس کی ذاتی حاجت روائی کے لیے قرض دے تو اس پر "ربوٰ" بڑھت کا طالب نہ ہو۔ جیسا کہ اوپر اشارہ گذرا انتھا عقل اس کو حماقت بتلائے گی۔ اس انسانی کردار کی عظمت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے عقل کو دین سے مدد لینا ہو گی۔ جہاں تک تمویل کا تعلق ہے اسلام ایک نہایت سادہ، عام فہم اور قابل عمل اصول بتاتا ہے اور وہ یہ کہ مقرض اور مقترض دونوں نفع نقصان میں اور منافع میں برابر کے شریک ہوں۔ عقل اس کی مصلحت کو بآسانی سمجھ سکتی ہے اور وہ یہ کہ فریقین میں سے کوئی ایک دوسرے کا استغلال نہ کر سکے۔ تمویل کا یہ طریقہ سترھویں صدی تک جب مسلمان صنعت، حرفت اور عالمی تجارت میں ہزیمت خوردہ ہونے کے باوجود خاصے ممتاز تھے تمدن و حضارت کی تمام ضروریات کے لیے کافی تھا۔ آج بھی مضاربت کا یہ طریقہ بالکل متروک نہیں ہوا ہے۔ اگر بنک کار مقرضین کی ہمت پست نہ کرے اور مقترضین کی بے جا حوصلہ افزائی نہ کرے تو یہ طریقہ بڑی سے بڑی صنعت اور تجارت کی صحت مند ترقی کا کفیل ہو سکتا ہے۔ بنک کار کی طرح کے "وسطاء" (Middle men) کا کردار بسا اوقات یہی ہوتا ہے کہ وہ بلا استحقاق اصلی فریقین سے اینٹھ لیتے ہیں اور مجموعی طور پر معاشرہ کے لیے مضر ثابت ہوتے ہیں۔

اس مثال سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ عقل کے نام پر تقلید غیر ہمارا شیوہ بن چکا ہے۔ مغرب کی صنعت اور تجارت، سود اور بنک کاری کے نظام کے ساتھ ہمارے سامنے آئی اور ہم نے مدہوشی کے عالم میں جس کا اوپر ذکر گذرا، سود اور بنک کاری کے نظام کے لیے اسلام میں جگہ نکالنی شروع کر دی۔ آج تقریباً پچاس برس سے ہم اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ اگر ہم مدہوشی کی کیفیت سے نجات پالیں اور عقل و ہوش کی راہ پر چلیں تو صحیح طریق کار یہ ہے کہ دیانتداری سے پہلے تو یہ معلوم کریں کہ ابتدائے اسلام سے عصر حاضر کے آغاز تک مسلمان کس اصول پر کاربند رہے اور اس کی بدولت ان کے اپنے زمانے میں کہاں تک سرخروئی یا رسوائی ہوئی، پھر یہ دیکھیں کہ اس اصول پر چل کر عصر حاضر میں ترقی خواہ وہ کسی قسم کی ہو، کیوں محال یا دشوار ہے، تب پھر اسلام میں تاویل، ترمیم یا اضافہ کی سوچیں۔ اس کے بجائے ہم کرتے یہ ہیں کہ اسلام میں تاویل، ترمیم اور اضافہ کی پہلے سوچتے ہیں، پھر دوسرے نقطہ سے بالکل آسان گذر جاتے ہیں اور بلا دلیل یہ فرض کر لیتے ہیں کہ عصر حاضر میں ترقی صرف انھیں اصولوں کو اپنانے سے ہو سکتی ہے جن پر ہم ترقی یافتہ قوموں کو کاربند دیکھتے ہیں، مسلمان چونکہ عصر حاضر میں ترقی یافتہ نہیں اس لیے اسلام عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اس کے بعد آخر میں دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں: یا یہ کہ عصر حاضر سے قبل سلف کے اصول بھی وہی تھے جو آج ترقی یافتہ قوموں کے ہیں یا یہ کہ سلف جن اصولوں پر کاربند تھے وہ ان کے زمانے کے لیے تھے، ہمارے لیے نہیں، ہمارے لیے اسلام کی روح کافی ہے نہ کہ وہ ہیئات و اشکال جو سلف کے زمانہ میں رائج تھیں۔ اسلام کو عصر حاضر کے مطابق ڈھالنے والوں کی تحریروں میں ہمیں یا تو یہ ملتا ہے کہ سود کی فلاں فلاں قسم سرے سے ممنوع ہی نہیں، فقہا اور علما تیرہ سو برس تک غلطی پر رہے، یا پھر یہ کہ عصر حاضر کی ترقیوں میں برابر کا حصہ لینا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ صرف اسلام کی روح پر اکتفا کرتے ہوئے ترقی یافتہ قوموں کے سارے نظام بلا تکلف اپنا لیے جائیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اسلام نے تمویل کا جو طریقہ معین کیا ہے اور جس پر مسلمان عصر حاضر کے آغاز تک کاربند رہے اور جو آج بھی کلیتہً متروک نہیں ہوا ہے بلکہ بڑی حد تک معمول بہ ہے وہ کیوں ترقی کے تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ ترقی کی خواہش، خواہ وہ مادی ترقی ہی کیوں نہ ہو، کوئی بری چیز نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ مادی ترقی کی خواہش روس کو بھی تھی۔ نیز نگی احوال دیکھیے کہ شیوعی انقلاب اس ملک میں آیا جو صنعتی لحاظ سے بالکل ہی پس ماندہ تھا جب کہ قائدین انقلاب کی

توقعات اور پیشین گوئیاں یہ تھیں کہ شیوعی انقلاب کا گہوارہ وہ ممالک ہوں گے جو صنعت میں آگے بڑھے ہوئے ہوں گے۔ بہرحال مادّی ترقی تو شیوعی نظام کا جزو نہیں بلکہ کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اگر شیوعیت مادّی ترقی کی خاطر اپنے آپ کو اس وقت کی ترقی یافتہ قوموں کے نظام سرمایہ داری کے مطابق ڈھال لیتی تو کہاں شیوعیت باقی رہتی اور کہاں شیوعیت کی روح؟ روس نے مادّی ترقی حاصل کر لی لیکن شیوعیت کی حدود کے اندر رہ کر۔ اسی باعث تو آج ہمارے یہاں کچھ لوگ اس خیال کے ہیں کہ شیوعیت کے ساتھ خدا[1] کو جمع کر دو (شیوعیت + خدا) اسی طرح جیسے کہ ہم نے انگریزی نظامِ تعلیم کے ساتھ "اسلامی نظریۂ حیات" کو جمع کر دیا ہے۔ دنیاوی مقاصد میں اسلام مددگار ثابت ہوگا اور اگر کوئی رندگستاخ آخرت کا ذکر چھیڑ دے تو اس کے لیے بھی اسلام کی روح (اسلامی شریعت نہیں اسلامی "نظریۂ حیات") کافی ہے۔ اب تک یہ طرزِ فکر معدوم ہے کہ زندگی کے مسائل سے کیا ڈرنا اور کیا ڈرانا۔ زندگی ایک ہے، زندگی کے مسائل ہر دین مذہب اور نظامِ زندگی کے متبعین کے لیے یکساں ہوتے ہیں۔ ہر دین مذہب اور نظامِ زندگی کی امتیازی شان بلکہ اس کے وجود کا جواز ہی اس میں ہوتا ہے کہ وہ ان مسائل کا نیا حل پیش کرے جیسے کہ روس نے مادّی ترقی اور خوش حالی کا ایک نیا حل پیش کیا۔ اگر مسائل اپنے ساتھ بندھے ٹکے حلول لے کر ابھریں تو پھر تو سبھی انسان "ملۃ واحدۃ" میں ضم ہو جائیں۔ دین تو دین پھر تو عقل کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بالکل اسی انداز پر ہمیں اقتصادیات کے دوسرے ابواب میں سوچنا ہوگا۔ مثلاً موجودہ نقد کے نظام کو لیجیے جو تمام تر حکومتوں کے تصرف میں ہے، فطری عوامل بالکل معطّل کر دیے گئے ہیں۔ اسلام کا موقف مختصراً یہ ہے کہ نقد کی مقررہ قیمت (Face Value) وہی ہونا چاہیے جو اس کی ذاتی قیمت (Intrinsic Value) ہو۔ نقد بھی ایک جنس ہے اور فطری عوامل کے تحت اجناس کی قیمت میں جو اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے اس سے نقد کی قیمت کا متاثر ہونا بھی فطری ہے[2] حمل و نقل کی سہولت کے لیے کاغذ کا نوٹ ایک نشانی (Token) ہے، یقین دہانی ہے، ایک "وعدہ" ہے کہ

---

[1] جو خدا سے بے نیاز ہیں ان کا ذکر ہی بے محل ہے۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم ... الخ

[2] چونکہ سونے چاندی کے گھریلو استعمال سے نقد کی قیمت متاثر ہوتی ہے اور اقتصاد پر برا اثر پڑتا ہے اسی لیے اس پر پابندیاں ہیں۔

معین مقدار میں زرِ نقد محفوظ ہے۔ اب اگر یہ وعدہ جھوٹا ہو تو؟ آخر جھوٹے سکہ اور جعلی سکہ پر پکڑ دھکڑ کیوں ہے؟

میں بھنکتا ہوں تو چھلنی کو بُرا لگتا ہے کیوں ؟
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی نہیں چھاج

یہ جو موجودہ دنیا میں "ہتھیلی پہ سرسوں جمانے" کا عمل جاری ہے اور اقتصاد کے جسم پر بادی گوشت چڑھنے لگتا ہے اور موٹاپے کے باعث حرکت قلب بند ہونے کا خدشہ ہوتا ہے اس میں بہت بڑا دخل اسی نقد کے نظام کے فساد کا ہے۔ نقد کے نظام میں "تلاعُب" اور من مانی جو موجودہ دور میں حکومتوں کا حق سمجھا جاتا ہے اسی سے یہ عبرت حاصل ہوتی ہے کہ عقل کو خود اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے وحی کے بتائے ہوئے اخلاقی سانچوں میں ڈھلنا چاہیے۔

یہ جو عقل والے اسلام سے کہتے ہیں: "زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ بساز" اسے بڑی تقویت ایک لفظ "تشکیلِ نو" (Reconstruction) سے ہوتی ہے جو اقبال کے لیکچرز کا عنوان ہونے کے طفیل چل پڑا ہے۔ عام طور سے یہ مغالطہ ہوتا ہے یا جانتے بوجھتے ہوئے اقبال کے ساتھ عقیدت کا سہارا لے کر یہ مغالطہ دیا جاتا ہے کہ تشکیلِ نو یا تعمیرِ نو اس عمل کا نام ہے جو "ہدم و بناء" پر مشتمل ہوتا ہے، یعنی یہ کہ پہلی عمارت کو ہدم کر دو، ڈھا دو، اور اس کی جگہ ایک نئی عمارت بنا کر کھڑی کر لو۔ اگر یہی ہے تو پھر تو "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت"۔ اسلام اگر نام کو رہا بھی تو ہمیشہ پھاوڑے کدال کی زد میں رہے گا۔ اقبال کے مجموعی فکر میں اس "ہدم و بناء" کی کوئی گنجائش نہیں[۱]۔ یہ اقبال پر سراسر بہتان ہوگا۔ حتیٰ کہ اقبال کے فنِ شاعری کی بابت بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے اردو شاعری کی قدیم عمارت ڈھا کر اس کی جگہ ترقی پسند ڈیزائن کی نئی عمارت کھڑی کی[۲]۔ قبل اس کے کہ کوئی یہ کہے کہ اچھا تو پھر ایک مرتبہ اسلام کی جو عمارت بن گئی

---

[۱] اس میں شک نہیں کہ اقبال کے چھٹے لیکچر (The Principles of Movement) میں ہدم کی بہت سی مثالیں ہیں۔ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ فکر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے اور اقبال وقتی جذبات کی رَو میں بہہ گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے میرا مقالہ: — 'A study of Iqbal's views on Ijma' Iqbal Review, Karachi, October, 1962.

[۲] دیکھیے میرا مقالہ "اقبال کے کلام میں روایت اور جدت"۔ اقبال ریویو، کراچی، جنوری ۱۹۶۱

وہ مرورِ زمانہ سے بوسیدہ ہو کر اپنے آپ گر جائے گی اور اس کے مکین ویرانہ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے ـــــ قبل اس کے کہ کوئی یہ کہے میں کہوں گا کہ آپ جتنی بھی تجدید کریں، پتھر تو جماد ہے، اس کی تشکیل، تعمیر، تجدید ہمیشہ بانی کے تخیل، مرضی، پسند اور عمل کے مطابق ہوگی۔ اس کے برخلاف اسلام میں "نمو از دھار" ہے۔ وہ ایک نبات کی مانند بڑھتا ہے، اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، پھلتا اور پھولتا ہے۔ یہ سب زورِ طبیعت کی بدولت اور اپنے مزاج اور فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے اس کی جڑیں ماضی میں اور زیادہ راسخ ہوتی جاتی ہیں، تنا اور زیادہ موٹا اور مضبوط ہوتا جاتا ہے، اس میں نئی نئی شاخیں پھوٹتی ہیں، نئے نئے پھول کھلتے ہیں اور پھل لگتے ہیں، لیکن نمو از دھار کے اس عمل میں اس کی اندرونی طاقتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ اس کا ارتقا اس کے اپنے نشاطِ روح (Elan vital) کا تابع ہوتا ہے۔ الغرض کسی باغبان کے تخیل یا مرضی اور پسند کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ باغبان کی عقل صرف اتنا کر سکتی ہے کہ اسے کھاد، پانی دے اور طفیلی پودوں سے بچائے رکھے تاکہ وہ سوکھنے نہ پائے اور اس کی بڑھت نہ رک جائے۔ کہنا یہ ہے کہ اگر اسلام کے باغبان اور چمن آرا اسلامی علوم کی آبیاری کریں اور انھیں تر و تازہ رکھیں تو اسلام کا تنا ور درخت طبعی تغیرات ـــــ گرمی سردی، آندھی، جھکڑ ـــــ کی مقاومت کرتا ہوا اپنی فطرت کے مطابق خود بخود بڑھتا رہے گا اپنے پتوں کی خود تجدید کرے گا اور ہر موسم میں نئے پھل دیتا رہے گا۔ کجا اسلامی علوم ـــــ قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ ـــــ اور کجا "اردو کا اسلامی لٹریچر" اور "اسلامی نظریۂ حیات" جن کی حیثیت "برگِ حشیش" سے زیادہ نہیں۔ میرے پیشِ نظر اعلیٰ تعلیمی ادارے ہیں، اَن پڑھ اور اَدھ پڑھے عوام نہیں کہ انھیں جو میسر آجائے وہی بہت ہے۔

"ہدم و بنا" کی خاطر باب اجتہاد پر یورش ہے۔ باب اجتہاد کھلا ہے اور ہمیشہ سے کھلا ہے بالکل اسی طرح جیسے قانون، طب، ہندسہ اور ابحاث ذریہ (Atomic researches) کا دروازہ کھلا ہے۔ صرف اتنا ہے کہ جب تک لوگ دیانتدار تھے وہ شرم و حیا کے ساتھ اپنے قصورِ علم کا اعتراف کرتے تھے اور بے جھجک نہیں داخل ہوتے تھے۔ کاش جو جد و جہد باب اجتہاد کے دروازے توڑنے میں کی جاتی ہے وہ اجتہاد کی تیاری میں صرف ہوتی۔ آخر یہ تو ضروری نہیں کہ جو دروازہ کھلا ہو اس میں ہر کس و ناکس گھستا چلا جائے۔ باب اجتہاد میں داخل ہونے کے آداب

شرائط کچھ اور ہیں اور حمام میں داخل ہونے کی ہیئت اور طریقے کچھ اور ہیں۔ اجتہاد کے آداب و شرائط تفصیل سے درج ہیں اور نہایت معقول ہیں۔ اجمالاً دو بڑے بڑے عنوانوں کے تحت آتے ہیں: ایک علم یعنی علم دین، دوسرے تقویٰ یعنی حسن نیت کے ساتھ اللہ کی مرضی کی تلاش۔ آخر ججوں سے بھی تو ان کے عہدہ کا حلف اٹھوایا جاتا ہے، پھر یہ تقویٰ کی شرط کیوں گراں گزرتی ہے؟ علم کے سلسلہ میں ایک بات ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اسلامی نظام تعلیم کی ایک نہایت قابل قدر روایت یہ تھی (اب یہ روایتیں کہاں؟ صرف حدیث کی حد تک خال خال ان کا لحاظ باقی رہ گیا ہے) کہ مصنف سے اس کی کتاب کی روایت کا سلسلہ چلتا تھا، اس طرح نہ صرف مصنف کے الفاظ بلکہ ان الفاظ سے اس نے جو معانی مراد لیے ہیں وہ اور ان کی تفسیر سلسلہ وار منقول ہوتی تھی اور کسی کو یہ حق نہیں ہوتا تھا کہ ڈکشنری کی ناقص مدد اور اپنی عقل کے زور سے الفاظ کو وہ معنی پہنائے جو مصنف کے ذہن میں نہ تھے۔ ادب میں بھی یہ ہے کہ جاہلی شعر کی جو قدیم شرحیں ہیں وہ قابل احترام ہیں اور ہمارے اپنے اجتہاد کی گنجائش بہت کم ہے۔ پھر کیا قرآن و حدیث کے سلسلہ میں یہ واجب نہیں کہ صحابہ اور تابعین نے جو مطلب لیا اور جو سمجھا اس کا ہم احترام کریں؟ یہ بھی کیا بات ہے کہ ایک مدرسی لغت سے کر بیٹھے، قرآن و حدیث کے الفاظ کے متعدد معانی میں سے ایک معنی چنا، اور اجتہاد کر ڈالا کہ ہمارے مفید مطلب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق، فلاں آیت اور فلاں حدیث کا مفہوم یوں بنتا ہے!!! ادب میں اس قسم کے اجتہاد کی ایک دلچسپ مثال ابن سلام الجمحی کی طبقات فحول الشعرا کا وہ ایڈیشن ہے جو محمود محمد شاکر نے شائع کیا ہے۔ انھوں نے جا بجا قدیم شعر سمجھنے میں قدیم شارحین سے ہٹ کر خود اپنا اجتہاد کیا ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ دین میں اجتہاد کرنے والے اسلام کی روح کو جدید قالب میں ڈھالتے ہیں اور وہاں قدیم شعر کے قالب میں جدید روح پھونک دی گئی ہے[1] ہمارے یہاں بھی کلام غالب کی ایسی شرحیں کم نہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنے بڑے ماہر اقتصادیات تھے! لغت کی رو سے سب چولیں برابر بیٹھتی ہیں۔

اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ کیسے کیسے لوگ ننگ دھڑنگ تفسیر و اجتہاد کے دروازہ میں گھس آتے ہیں تو

---

[1] دیکھیے میرا نقد اس کتاب پر ــــ مجلہ "الکتاب" (القاہرہ) اپریل ۱۹۵۲ م

دکتورہ بنت الشاطی کا وہ طویل مقالہ پڑھے جو انھوں نے مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس کے اجلاس میں شرکت کے بعد دہلی سے واپسی پر "الاہرام" مورخہ ۲۰ رمارچ ۱۹۶۴ میں شائع کیا تھا۔ لکھتی ہیں کہ جو عربی سے نابلد ہے وہ قرآن کا ترجمہ اور تفسیر کر ڈالتا ہے۔ آخر میں کہتی ہیں کہ گو ہمیں (مصریوں کو) یہ حق نہیں کہ دوسرے ممالک میں شائع ہونے والی کتابوں پر پابندی لگائیں لیکن اتنا تو ہو کہ چند علما قرآن کی عزت و ناموس کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اللہ کی کتاب کو "عبث المترجمین و خطأ الشراح و عَلل دان المقتبسین" سے بچائیں۔"

یہ حضرت عمرؓ کے سارے فقہی کارناموں کو چھوڑ کر صرف چند "اولیات عمرؓ" کیوں ہماری توجہ کا مرکز بنی ہیں؟ اسی لیے ناکہ "ہدم و بناء" کے پہلے جزو (ہدم) کی سند کہیں نہ کہیں سے، ڈھونڈ کر نکالنی ہے؟ میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا جو فی الواقع کسی حد تک جواب کی محتاج ہیں: پہلے "مولفۃ القلوب" کے مسئلہ کو لیجیے۔ اگر آج ہندوستان میں کوئی ہندو اسلام لاتا ہے یا قبول اسلام کا ارادہ کرتا ہے تو کتنی ہی مشکلات ہوں گی جو ایک کمزور ارادہ والے انسان کو باز رکھیں گی۔ اس کی جان، مال، نوکری سب خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی پاکستان میں اسلام لائے تو وہ تو ہو سکتا ہے مال و دولت ملازمت ہی کی لالچ میں اسلام لائے۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہو گا کہ وہ اس ہندو کی جو مائل بہ اسلام ہے تالیف قلوب کریں، پاکستان میں اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ پھر اگر وہ نومسلم ہندوستانی مسلمانوں سے وظیفہ لینا اپنا حق سمجھنے لگے اور پاکستان آجائے تو یہاں کے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی بڑھا چڑھا کر اس وظیفہ کا جھوٹا کلیم (Claim) بھی داخل کر دے۔ اگر ایسا ہو تو عقل کیا کہتی ہے۔ جو عقل کہتی ہے وہ قرآن و سنت کے عین مطابق ہے۔ حضرت عمرؓ نے صرف اتنا ہی کیا تھا، ویسے مولفۃ القلوب کی مد آج بھی باقی ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینوں کو مقاتلین میں تقسیم نہیں ہونے دیا۔ اچھا تو یہ تقسیم کس آیت اور کس سنت کی رو سے فرض تھی؟ اس سب کا مدلل، عالمانہ، اور سنجیدہ جواب اس مقالہ میں موجود ہے جو حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے معارف (اعظم گڈھ)، اگست، ۱۹۵۰ و مابعد میں شائع ہوا۔ فتح عراق سے پہلے یہ صورت حال پیش ہی کب آئی تھی کہ اتنا رقبہ زمین ہاتھ آئے جو رضاکار فوجیوں کی خود کاشت کی ضرورت سے زیادہ ہو؟ پھر "جنود مرتزقہ" (Standing armys) کا اس سے پہلے کسی کو خیال بھی آیا تھا؟ یہ خیال تو اس وقت آیا، اور اسی وقت

آنا بھی چاہیے تھا جب ایران کے مفتوحہ علاقوں میں چھاؤنیاں قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ اسلامی شریعت کا "نمو" ہے۔ نمو میں کچھ تغیر تو ہوتا ہے لیکن "ہدم" نہیں۔ اپنی جوانی کا مقابلہ اپنے بچپن سے کر کے دیکھیے۔ نمو کے عضوی (Organic) تغیرات نظر آئیں گے۔ اسی طرح اجتہاد بھی قرآن و سنت کا عضوی نمو و ارتقا ہے۔ اسی کو فقہا و محدثین یوں کہتے ہیں کہ اجتہاد کی سند قرآن و حدیث سے ضروری ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہماری عقلیں "مسلم" ہیں۔ جو عقل اسلام لا چکی ہو اسے "تحرر" زیب نہیں دیتا۔ "عقلِ مسلّم" کا دائرۂ عمل فقہ دین ہے۔ اجتہاد اس کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ اجتہاد کا شوق مبارک، لیکن اجتہاد ثمرہ ہے علومِ اسلامیہ کی ترقی کا۔ بغیر شجر کے ثمر کی توقع؟ قرآن و سنت سے رضائے الٰہی دریافت کرنا کم از کم اتنا علم چاہتا ہے جتنا ذرہ کا دل چیرنے کے لیے ایک سائنس دان کو درکار ہوتا ہے۔ اگر اجتہاد کی ضرورت ہے، اور بے شک ہے، تو اسلامی علوم کے ساتھ وہی اعتنا کیجیے جو سائنس کے ساتھ کیا جاتا ہے، اور خدارا اسلام کو بحیثیت ایک علم کے سیاست سے بالکل منفرد (Unrelated) رکھیے۔ اتنا حق تو ہر علم کا تسلیم کیا جاتا ہے، پھر اسلام تو ایک مقدس علم ہے۔

اسلام اور چند معاشی مسائل

از سید یعقوب شاہ

اس کتاب کے مصنف مالیات کے بھی ماہر ہیں اور دینی علوم سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ اپنی اس تصنیف میں انھوں نے ربوٰ، زکوٰۃ اور بیمہ جیسے زندہ اور اہم معاشی مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے اور کتاب و سنت، تاریخ، عمرانیات اور اقتصادیات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنے نتائجِ فکر شستہ اور سلیس انداز میں قلم بند کیے ہیں۔

قیمت عام ایڈیشن ۵ روپے عمدہ ایڈیشن ۶/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور